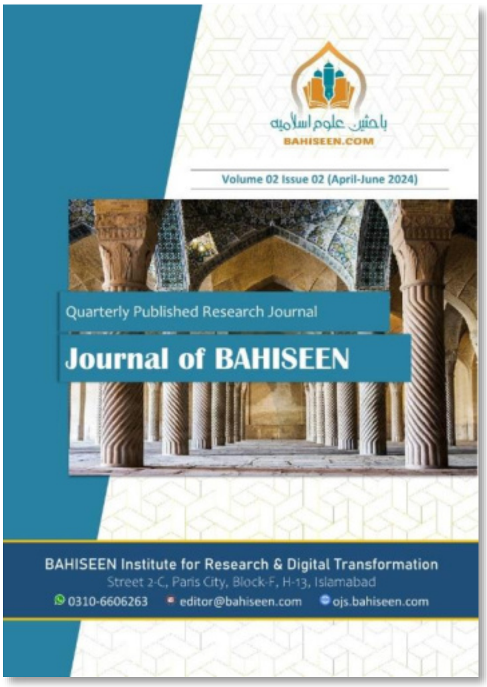

Title
Journal of BAHISEEN
Issue
Volume 02, Issue 02
April-June 2024
ISSN
ISSN (Online): 2959-4758
ISSN (Print): 2959-474X
Frequency
Quarterly

Copyright ©
Year: 2024
Type: CC-BY-NC
Availability
Open Access

Website
ojs.bahiseen.com
Email
editor@bahiseen.com
Contact
+923106606263
Publisher
BAHISEEN Institute for
Research & Digital
Transformation, Islamabad

جدید فکری مسائل: سید ابوالحسن علی ندوی کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ

Challenge in Modern Thoughts: Analytical Study of Syed Abul Hasan Ali Nadvi's Thoughts

Dr. Muhammad Abubakar Siddique
Research Associate, Islamic Research Index, AIOU Islamabad
Email: muhammad.abubakar@aiou.edu.pk
ORCiD: 0000-0003-3160-5697

Abstract:

This research paper delves into the intricate realm of modern intellectual challenges through an analytical exploration of the eminent scholar Syed Abul Hasan Ali Nadvi's ideologies. In an era marked by rapid globalization and evolving socio-political landscapes, understanding Nadvi's perspectives becomes pivotal in grasping the multifaceted challenges faced by contemporary societies. The paper scrutinizes Nadvi's thoughts on diverse facets, encompassing religious discourse, societal transformations, educational paradigms, and the interface between tradition and modernity. Employing a comprehensive analytical framework, the study unravels the nuanced layers of Nadvi's philosophies, highlighting their relevance and implications in confronting modern challenges. By scrutinizing Nadvi's scholarly works, speeches, and writings, this paper aims to offer profound insights into his intellectual contributions and their pertinence in navigating the complexities of modern thought. Through critical analysis and contextual interpretation, this study contributes to a deeper comprehension of the challenges encountered in modernity, bridging the gap between historical wisdom and contemporary issues.

Keywords: Syed Abul Hasan Ali Nadvi, modern thoughts, challenges, analytical study, contemporary ideologies

جدید فکری مسائل: سید ابوالحسن علی ندوی کے افکار کا تجزیاتی مطالعہ

عصر حاضر میں مسلمانوں کو بے شمار چیلنجز در پیش ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بقول اس دور کا سب سے بڑا چیلنج "مغربی تہذیب کی کامل پیروی ہی زندگی کی شرط اور ترقی وطاقت کی واحد راہ"[1] ہے۔ دنیا مغرب کے پیروی میں اندھا دھند بھاگی چلی جارہی ہے۔ اس فکر و تہذیب نے بہت سی تہذیبوں کو اپنے اندر ضم کرلیا ہے اور دیگر تہذیبوں کی شناخت کو مٹا کر رکھ دیا ہے۔ دیگر تہذیبوں کی طرح مسلمان بھی اس تہذیب سے بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ خود مغربی دنیا بھی سر توڑ کوشش کررہی ہے کہ مغربی تہذیب مسلم ممالک میں پوری طرح نفوذ کرجائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی فکر و تہذیب کو اگر خطرہ لاحق ہے تو وہ صرف مسلم تہذیب سے ہے۔

مغربی تہذیب سے قبل دنیا کی سب سے بڑی تہذیب مسلم تہذیب تھی اور اس نے صدیوں تک دنیا کو مسحور کیے رکھا ہے۔ اگر مسلم حکمرانوں سے وہ سنگین غلطیاں نہ ہوتیں جس کی بناپر انہیں سیادت و قیادت سے ہاتھ دھونا پڑے تو آج مسلم تہذیب مغربی تہذیب پر حاوی ہوتی اور اسے مغربی تہذیب کا دست نگر نہ ہونا پڑتا۔

اس وقت مغربی تہذیب کو عالم اسلام ہی سے خطرہ ہے اور وہ عالم اسلام کی بیداری سے قبل پوری طرح مسلم ممالک پر تہذیبی فتح چاہتی ہے۔ مغربی تہذیب کے علم برداروں کی اسی سوچ اور محنت نے مسلم ممالک میں ایسی کشمکش کو جنم دیا ہے جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایمانی قوت و حمیت اور مستقبل کے لیے شعور اور مغربی فکر و تہذیب کے مقابلے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے۔

1.1 اخلاقی تغیر وزوال

اس عہد میں پے درپے انقلابات کے باعث اخلاقی قدروں اور معیارات میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ چوں کہ معاشرے میں مذہبی قدریں متاثر ہوئی ہیں اس لیے اخلاقی بنیادیں بھی متزلزل ہوئی ہیں اور لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔ برصغیر پر انگریزوں کے تسلط کے بعد اخلاقیات بہت متاثر ہوگئی تھیں انگریزوں کی آمد سے پہلے کی اخلاقی اقدار کو مولانا ندوی اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

> "اسلامی مشرق میں افراد معاشرہ کے باہمی تعلقات اتنے مستحکم دیرپا اور عمیق تھے جو اس زمانہ کے تصور سے بالاتر ہیں۔ اولاد کی محبت والدین کے ساتھ، خورد کی تعظیم بزرگ کے لیے، بزرگ کی تواضع و شفقت، عورت کی عفت مآبی، ازدواجی وفاداری۔۔۔ دوستوں کے لیے ایثار و قربانی اور ہمدردی، اس میں سے ہر ایک ایسا

> وسیع عنوان ہے جس کے ماتحت ایسے واقعات ہیں جن کو زیادہ زمانہ گزر جانے کے بعد آسانی سے باور نہیں کیا جائے گا لیکن ابھی بھی ان کے باور کرنے اسباب و قرائن موجود ہیں۔“[2]

انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی اخلاقی حالت بہت بہتر تھی۔ سیاسی ہنگاموں اور افراتفری کے باعث جو تبدیلی آئی وہ فطری تبدیلی تھی۔ اس کے بعد جو تبدیلی انگریزوں کے اثرات سے آنا شروع ہوئی وہ اخلاقی بگاڑ ہے جو اخلاقی قدروں کی تبدیلی سے واقع ہوا۔ یہ فطری نہیں تھا، حکمرانوں کے تہذیبی اور فلسفیانہ اثرات تھے۔ ان کے تہذیبی و فلسفیانہ اثرات کیا تھے؟ یہ یورپ میں لذت و افادیت کے دو اخلاقی فلسفے ہیں جنہیں اخلاقی قدروں میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی رو سے انسان کی خوش اخلاقی کا سبب لذت یا افادیت میں سے کسی ایک کا لالچ ہے۔ جسے ہم عام محاورے میں خود غرضی یا مفاد پرستی کہتے ہیں۔ مغربی تہذیب میں اخلاص اور بے غرضی نام کا تصور موجود نہیں تھا کیوں کہ اخلاص اور بے غرضی کا ماخذ مذہب ہے اور مغربی تہذیب میں مذہب کا دائرہ عبادت گاہوں تک محدود ہے۔ جب کہ اسلامی معاشرے میں خود غرضی اور مفاد پرستی دونوں اخلاق رذیلہ میں سے ہیں۔ مولانا ندوی نظریہ افادیت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ”سترھویں صدی عیسوی سے افادیت کا غلبہ ہوتا گیا، مغرب کے علمائے اخلاق نے ڈنکے کی چوٹ پر کہنا شروع کیا اخلاق میں سے جس چیز کا فائدہ ظاہر نہ ہو وہ قابل اعتنا نہیں ہے۔۔۔ نتیجہ یہ ہے کہ اخلاق کہ تحدید و تعریف افادہ و انتفاع سے کی گئی۔۔۔ اور عملاً فلسفہ اخلاق کا کسی ایسی چیز سے سروکار نہ رہا جس کا کوئی مادی و محسوس نفع نہ ہو۔ رفتہ رفتہ یہ مادی ذہنیت اور افادیت ساری زندگی پر چھا گئی۔“[3]

آج ہم اخلاقیات میں جس قدر خود غرضی دیکھتے ہیں وہ مغربی تہذیب ہی کی مرہون منت ہے۔ اہل دانش کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج ہے کہ وہ اس مسئلے کا حل ڈھونڈیں۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے ہمیں ایک طویل محنت کی ضرورت ہے کہ ہم امت مسلمہ کے دلوں سے اغیار کی عظمت نکال دیں اور انہیں اسلامی فکر کے مطابق بے غرضی اور اخلاص کا درس دیں تا کہ ان میں اسلامی فکر بیدار ہو اور وہ معاشرے کو بہتری کی طرف گام زن کر سکیں۔

1.2 لادینیت اور ارتداد

مسلمانوں میں ارتداد کا پہلا واقعہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد عہد صدیقی میں پیش آیا جن کے خلاف کارروائی کی گئی اور یہ فتنہ ختم ہو گیا۔ بعد کے ادوار میں ایسا فتنہ ساماں ارتداد دیکھنے میں نہیں آیا۔ اگرچہ بعض مواقع پر کفار کی طرف سے

مہم چلائی گئی مثلاً اسپین سے مسلمانوں کی بے دخلی اور ہندوستان کی شدھی تحریک اسی نوع کی کوششیں تھیں۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مسلمان اجتماعی طور پر ارتداد کی طرف مائل ہو گئے ہوں۔ اللہ تعالی نے مسلمانوں کو اسلام سے گہری وابستگی دی ہے جس کا اعتراف غیر مسلم بھی کرتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں اکا دکا واقعات ارتداد کے پیش آئے تو مسلمانوں نے مرتد سے مکمل قطع تعلقی کی ہے اور اسے اپنے معاشرے سے خارج قرار دیا۔ اس رد عمل کی وجہ سے مسلمان اور مرتد کی تفریق بڑی واضح تھی اور کسی قسم کی پیچیدگی نہ تھی۔

لیکن عصر حاضر میں ہمیں ارتداد کی ایک نئی صورت سے واسطہ پڑا ہے۔ یہ صورت ارتداد کی نئی قسم ہے مگر فتنہ سامانی میں سابقہ تمام ارتدادی روایات سے بازی لے گئی ہے۔ اس ارتداد سے بہت تھوڑے لوگ محفوظ رہے ہیں ورنہ علاقے کے علاقے اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ یہ فکری اور اعتقادی ارتداد ہے اور یہ کئی حوالوں سے سنگین ہے اور صریح ارتداد سے زیادہ خطرناک ہے۔ مثلاً

صریح ارتداد میں ارتداد سب پر واضح ہو جاتا ہے اور اہل اسلام مرتد کو ملت اسلامیہ سے خارج سمجھتے ہیں، اس سے کفار والا معاملہ کیا جاتا ہے، اس کی شرارتوں اور فتنوں سے مسلمان محفوظ رہتے ہیں۔ وہ اسلام کے بارے میں کوئی نامناسب بات کہتا ہے تو لوگ اس کی بدنیتی کو فوراً بھانپ لیتے ہیں۔

جب کہ فکری ارتداد میں مبتلا انسان کی پہچان بہت مشکل ہے۔ سادہ لوح مسلمان اس کی شرارتوں اور فتنوں سے آگاہ نہیں ہوتے، وہ اس پر اعتماد کرتے ہیں اور اس کے دام میں پھنس جاتے ہیں۔ یوں مسلم معاشرے میں فساد کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اہل علم بھی ایسے لوگوں کی تکفیر کی بابت آزمائش میں پڑ جاتے ہیں اور ظاہری حالات کی بنا پر ارتداد کے فتوے سے پرہیز کرتے ہیں جس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے فتنہ پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے۔

عصر حاضر میں فکری ارتداد کی کوشش

دین اسلام ہر لحاظ سے مکمل دین ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

(المائدة:03)

ایمان اور یقین ہمارے دین اور دینی تصورات کی بنیاد ہے۔ اللہ، رسول، فرشتے، آسمانی کتابیں، آخرت، حشر نشر، جنت جہنم ایسے حقائق ہیں جنہیں ہم نے ایمان کی بنیاد پر بغیر دیکھے تسلیم کیا ہے۔ ان حقائق کو تسلیم کرنے کے بعد اللہ تعالی نے ہمیں

جو احکام دیے ہیں خواہ وہ فرد کے متعلق ہیں یا تمام معاشرے کے متعلق؛ ہم ایک مؤمن کی حیثیت سے اسے من و عن قبول کرتے ہیں۔

مغربی تہذیب کی یلغار اپنے ساتھ مغربی تصورات اور فلسفے لے آئی ہے۔ ان فلسفوں میں ایمانیات نام کی کوئی چیز شامل نہ ہے۔ موجود وہی ہے جو نظر آتا ہے، جو نظر نہیں آتا وہ موجود بھی نہیں ہے۔ ان فلسفوں میں سیاست اور اقتصادی نظریات، عمرانی اور معاشرتی نظریات، غرض ہر قسم کے نظریات تھے۔ مگر ان کا بنیادی فلسفہ یہی تھا کہ دنیا وہی ہے جو ہماری نظروں کے سامنے موجود ہے۔ آنکھوں سے اوجھل کوئی عالم یا دنیا نہیں ہے۔ کارخانہ عالم جو منظم انداز سے چل رہا ہے یہ سب اتفاقات کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ وہ فکر ہے جسے ہم الحاد اور لادینیت سے یا دہریت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس نظریے کی بنا پر سائنس کی ترقی بھی اس راہ پر چل پڑی کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے مادی حقائق اور اسباب تلاش کیے جائیں۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

> ”یہ فلسفے مشرقی اسلامی معاشرے پر حملہ آور ہوئے اور اس کے باطن تک گھس گئے۔ یہ فلسفے سب سے بڑا دین تھے جو تاریخ میں اسلام کے بعد ہوئے۔ سب سے بڑا دین اپنی وسعتِ اشاعت کے لحاظ سے، سب سے گہرا دین اپنی جڑوں کے لحاظ سے اور سب سے طاقت ور ترین دین دلوں اور دماغوں کو مسخر کرنے کے لحاظ سے۔ اسلامی ملکوں کا وہ طبقہ جو علم و فہم میں ممتاز تھا اس دین پر فریفتہ ہو گیا۔ اس نے اسے نہایت خوش گواری کے ساتھ حلق سے اتارا اور اطمینان کے ساتھ ہضم کر لیا۔[4]“

ان نظریات کے پیروکار خواہ اس نئی فکر کو دین نہ کہتے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس فکر کے دین ہی کی طرح پیروکار ہیں۔ وہ ان نظریات کی آب یاری کے لیے دن رات کوشاں ہیں، ان نظریات کی ترویج کے لیے محنت کرتے ہیں، ان نظریات پر انہیں فخر ہے، وہ ان کے تخلیق کاروں کا اسی عزت و احترام سے نام لیتے ہیں جس طرح شارع کا لیا جاتا ہے۔ یہ طبقہ دینی تصورات کو مذاق اور پرانے قصے سمجھتا ہے، تمسخر اڑاتا ہے، تاویلات سے کام لیتا ہے مگر الحادی نظریات کا وکیل بن جاتا ہے۔

اہل اسلام کے طرز عمل کی یہ تبدیلی دراصل ارتداد ہی کی ایک شکل ہے۔ ہمارے ارد گرد اس سے متاثر بے شمار لوگ موجود ہیں۔ مولانا ندوی کے الفاظ میں یہ ایک لاوارث مسئلہ ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ”بلاشبہ یہ ارتداد ایک لاوارث مسئلہ ہے لیکن وہ مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کرا سکا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس ارتداد کا مارا ہوا کلیسا یا ہیکل میں نہیں جاتا اور نہ اپنے ارتداد اور تبدیلی مذہب کا اعلان کرتا ہے۔ نہ معاشرہ اس پر

> چونکتا ہے کہ احتساب و عتاب کی صورت پیش آئے۔ وہ بدستور اسی سوسائٹی اور
> معاشرے میں رہتا ہے۔”[5]

فکری ارتداد کے اسباب

فکری ارتداد نے مسلم ممالک کو بری طرح اپنی لپیٹ میں لیا ہے اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے۔ اس ضمن میں پہلا سبب تو یہ ہے کہ انیسویں صدی میں اہل اسلام کو پے در پے کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف خلافت عثمانیہ کا زوال ہو رہا تھا، دوسری طرف ہندوستان میں اسلامی سلطنت انگریزوں کے ساتھ بر سر پیکار تھی، تیسری طرف عیسائی مشنریز پورے وسائل کے ساتھ حملہ آور تھیں۔

حالت جنگ اور عبوری دور

اس دور میں مسلمان قیادت دشمنوں کے خلاف بر سر پیکار تھی جسے وقت کی نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کا موقع نہیں ملا۔ یہ کشمکش ڈیڑھ صدی تک جاری رہی۔ اس طویل جنگ میں دو نسلوں کا فاصلہ پیدا ہوا جسے مکمل اور مقتدر اسلامی ماحول میں نشو و نما کا موقع نہیں مل سکا۔ اسی دوران اہل مغرب نے اپنی منصوبہ بندی کے بل بوتے پر ملت اسلامیہ کو میدان کارزار میں الجھائے رکھا اور فکری میدان خالی رہا اور وہ اس میدان میں محنت کرتے رہے۔

انسان کی فطری کمزوری

فکری ارتداد کا ایک بہت ہی بڑا سبب انسانی فطرت کی کمزوری ہے۔ اسلام حرکت و عمل کا دین ہے۔ یہ انسانوں سے رو بہ عمل رہنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ نفس پرستی اور مادی دنیا میں منہمک رہنا اسلامی نقطہ نظر سے انسانیت کے لیے زہر قاتل ہے۔ جب کہ اہل مغرب اگرچہ خود تو اسلام کے خلاف ہمیشہ سرگرم رہے اور اس کام میں انہوں نے کبھی سستی نہیں دکھائی لیکن مسلمانوں کے لیے ان کا تہذیبی پیغام یہی ہے کہ دنیا عیش و آرام کے لیے ہے، یہاں کی نعمتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونا ہی زندگی کی کامیابی ہے۔ انسانی فطرت اپنی کمزوری کی وجہ سے راحت و آرام کی طرف مائل ہے اور مغرب کی چکا چوند روشنیوں کے پیچھے چل پڑی ہے اور دنیاوی سہولیات کی تلاش میں ہے۔ اس سے نوجوانوں میں سہولت پسندی پیدا ہوئی ہے اور اسلامی نظریہ حیات بھی سرد پڑ گیا ہے۔ سہولت پسندی کی وجہ سے نوجوان اسلام کو ایک مشکل دین کے طور پر دیکھنے لگے ہیں جو انہیں دنیاوی لذتوں کے حصول سے روکتا ہے۔

نوجوانوں سے رابطے کی کمی

مولانا ندوی نے نوجوانوں سے رابطے کی کمی کو بھی فکری ارتداد کا سبب قرار دیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ”مزید برآں یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں سے رابطہ نہیں رکھا گیا اور نہ ان کے ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کی گئی حالاں کہ آنے والا دور انہیں کا تھا۔ اس نوخیز نسل کو اس بات کا قائل کرنے کی بہت کم کوشش کی گئی کہ اسلام ایک سدا بہار پیغام اور دین انسانیت ہے۔ قرآن ہی وہ تنہا معجزہ اور ابدی کتاب ہے جس کے عجائبات کی انتہا نہیں ہے۔“[6]

اسلام کے فلسفے کی آفاقیت اور عالم گیریت، اس کے فوائد و برکات کا موضوع ہمیشہ سے تشنہ رہا ہے۔ ان موضوعات کے فکر و فلسفے پر مزید تحقیق اور اشاعت کی ضرورت ہے تاکہ نوجوان نسل کے سامنے اسلامی فلسفے کی اہمیت واضح ہو اور اس پر مغربی فکر و تہذیب کی خامیاں آشکارا ہوں۔ ہماری نوجوان نسل اسلامی عبادات کی فکر، فلسفے اور حقیقی زندگی میں اس کے فوائد کی بجائے اس کے ثواب کی روایات سننے کی عادی ہے۔ اسی طرح برائیوں اور گناہوں کے حقیقی زندگی میں نقصان کی بجائے اس کے اخروی عقاب اور تعذیب پر توجہ دیتی ہے۔ بالفاظ دگر امت مسلمہ نیکی اور گناہ کے ثواب و عذاب کو توجہ کے لائق سمجھتی ہے مگر حقیقی زندگی میں ان کے فوائد و نقصان کو نظر انداز کر دیتی ہے اور اسے قابل توجہ نہیں سمجھتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نسل عدم توازن کا شکار ہے۔ یہ دنیا میں اپنے نفس کی خواہشات کو پورا کرنا چاہتی ہے اور آخرت میں کامیابی کی امیدوار بھی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ نسل یا تو الحاد اور لادینیت کا شکار ہو جاتی ہے اور اگر راہ راست پر رہے تو ایک ایسی نسل تخلیق ہوتی ہے جو ہر وقت گناہ اور ثواب کی سرحد پر کشمکش Confusion کا شکار ہے اور اس میں خود اعتمادی اور امید کا فقدان ہے۔

نفاق اور الحاد

مولانا ندوی نے یہاں ایک اور نکتے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فکری ارتداد کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ جدید مرتدین اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے یہاں کے اسلامی حقوق سے مستفید بھی ہونا چاہتے ہیں لیکن ان کی وفاداریاں اہل مغرب کے ساتھ ہیں۔ وہ یہاں منافقت سے کام لیتے ہوئے الحاد اور لادینیت کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ”وہ اس پر تیار نہیں ہوتے کہ کہ اسلامی سوسائٹی سے بھی اپنا رشتہ کاٹ لیں حالاں کہ دنیا بھر میں اسلامی معاشرہ ہی تنہا وہ معاشرہ ہے جس کی تاسیس و

> ترکیب عقیدے کی بنیاد پر ہے اور مخصوص عقائد کی بنا پر اسلامی معاشرہ وجود ہی میں نہیں آتا۔ لیکن یہ نئے مرتدین اصرار کرتے ہیں کہ اس معاشرے کے نام پر فوائد حاصل کرتے ہوئے اپنی جگہوں پر جمے رہیں اور اسلام کے بخشے ہوئے تمام حقوق سے متمتع ہوتے رہیں۔ یہ ایک نرالی صورت حال ہے جس سے اسلام کی تاریخ کو کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔"[7]

1.3 آزادی نسواں اور عورت کے حقوق

ازمنہ قدیم میں عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک تاریخی حقیقت ہے۔ ہندوستانی تہذیب میں 'منو سمرتی'، رومی اور حمورابی تہذیبوں میں عورت کو انتہائی پست درجہ دیا گیا تھا اور عورت گناہ اور نجاست کی علامت تھی۔ حضور ﷺ سے ماقبل کی تمام تہذیبوں میں عورت سے متعلق مایوس کن تصورات تھے اور عیسائیت میں بھی حضرت مریمؑ کے سوا کسی کو استثنا حاصل نہ تھا۔ اسلام نے عورت کو معاشرتی حقوق دیے اور اسے معاشرے کے فردِ کامل کے طور پر تسلیم کیا۔ عورت کا یہ درجہ قرآن و حدیث میں جگہ جگہ وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔

عورت کو جو حقوق دیے جاتے ہیں ان کی وجہ سے عورت پر چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کہ وہ شوہر کی راحت رسانی کا ذریعہ بنے۔ اس کے ساتھ وفاداری کرے۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کے مال اور آبرو کی حفاظت کرے۔ بچوں کی پرورش کرے۔

یہ کام عورت کو اپنے شوہر کے لیے سرانجام دینے ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ عورت کا نگہبان ہے اور اس کے لیے زندگی کی تمام ضروریات فراہم کرنے کا پابند ہے۔ عورت کو صرف یہ ذمہ داریاں ادا کرنی ہوتی ہیں۔ اس کے سوا عورت کا ذاتی مال یا کوئی بھی چیز جو اسے اس کے شوہر نے دے دی ہو، والدین کی طرف سے ملی ہو یا کسی اور سبب سے اس کی ملکیت میں آئی ہو وہ اس کی ذاتی اور انفرادی ملکیت ہے جس میں اس کے شوہر کو بھی دخل اندازی کا حق نہیں ہے حتی کہ اس کی مرضی کے بغیر اس کا نکاح بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام نے عورت کے حقوق کا مکمل پیکج متعارف کرایا ہے۔ اگر عورت کے ساتھ کہیں بھی زیادتی ہوتی ہے تو اسے شکایت اور مقدمے کا حق حاصل ہے۔

عصر حاضر کا چیلنج یہ ہے کہ مغرب میں عورت کی ذمہ داریوں کو پابندیوں کا نام دے دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ذمہ داریاں عورت کی نہیں ہیں کہ وہ شوہر کی اطاعت کرے، یا شوہر اپنی بیوی سے حقوق زوجیت کی ادائیگی کا مطالبہ کرے، یا بچوں کی پرورش کا مطالبہ کرے۔ اسی طرح ان کے نزدیک مرد کی بھی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ عورت کا بوجھ اور خرچ برداشت

کرے ۔ مغربی تہذیب و فکر کے مطابق مرد ہو یا عورت ان معاملات میں آزاد ہے ۔ گویا عورت کے مقام اور ذمہ داریاں معاشرے میں مرد کے برابر ہیں اور حقوق بھی مرد کے برابر ہیں۔

مولانا ندوی مذہب و اخلاق کا انسائیکلوپیڈیا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”پیغمبر اسلام نے یقیناً عورت کا درجہ اس سے زیادہ بلند کیا جو اسے قدیم عرب میں حاصل تھا۔ خصوصی طور پر عورت متوفی شوہر کے ترکہ کا جانور نہیں رہی بلکہ خود ترکہ پانے کی حق دار ہو گئی اور ایک آزاد فرد کی طرح اسے دوبارہ شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ طلاق کی حالت میں شوہر پر یہ واجب ہو گیا کہ وہ اسے وہ سب چیزیں دے دے جو اسے شادی کے وقت ملی تھیں۔“[8]

اہل مغرب کی نقالی میں اور اہل مغرب کی شدید خواہش پر مسلم دنیا میں اس قانون کو لاگو کرنے کی بھرپور کوششیں جاری ہیں۔ عورتوں کو طرح طرح سے آزادانہ زندگی کے خواب دکھائے جا رہے ہیں تاکہ مسلمان عورتیں بھی مغربی عورتوں کی طرح زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ کالجز اور یونیورسٹیز میں مخلوط تعلیمی ماحول، میڈیا اور انٹرٹینمنٹ کے ساتھ ساتھ این جی اوز کے ذریعے بھی اسی پیغام کو عام کیا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے کی نوجوان نسل اس راہ پر چل نکلی ہے اور ان اثرات سے صرف وہی مسلم گھرانے بچے ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو اس فتنے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اہل دانش کے لیے یہ چیلنج ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے سیلاب کے آگے بند باندھیں، خواتین کے حقوق پر اسلامی نظریات کو عام کریں تاکہ خواتین میں اسلامی تہذیب و تمدن کی اہمیت اجاگر ہو اور مغرب کے ان کھوکھلے نعروں کے پیچھے مسلمان خواتین اپنی دنیا اور آخرت برباد نہ کر بیٹھیں۔

1.4 ملی وحدت

عصر حاضر میں ایک بڑا چیلنج ملی وحدت کا ہے کہ مشرق و مغرب میں بسنے والے مسلمانوں میں اخوت اسلامی اور فکر ملت کا احساس پیدا ہو جائے۔ مغربی استعمار نے مسلمانوں کی ملی وحدت کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ ممالک کو داخلی معاملات میں اس قدر الجھا دیا گیا ہے کہ اب ایک ملک دوسرے ملک میں بسنے والے مسلمانوں کی خبر گیری بھی نہیں کر سکتا۔ بین الممالک مفادات کی لکیر کے اس پار اہل کفر کے ہاتھوں بہت بڑے انسانی المیوں نے جنم لیا ہے مگر مسلم ممالک کی حکومتیں اس معاملے پر آواز نہیں اٹھاتیں۔

اس وقت دنیا بھر میں علاقائیت کا رجحان غالب آ رہا ہے اور ہر ملک اپنے ملکی مفادات کو سامنے رکھ کر اپنی پالیسی بناتا ہے اور اسی پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہ تصور اسلامی اخوت اور اسلام کے آفاقی پیغام کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ جب کہ دوسری طرف اہل کفر آپس کے اختلافات کے باوجود اسلام کو نقصان پہنچانے کی خاطر ہمیشہ ایک پلیٹ فارم پر نظر آتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان سچ ثابت ہو جاتا ہے کہ ”الکفر ملۃ واحدۃ“۔ دنیا کی بھلائی اسی میں ہے کہ اسلامی وحدت کو رواج دیا جائے۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

> ”آج بھی دنیا میں وحدت کے نام سے وحشتیں کارفرما ہیں، آج بھی وحدت کے نام سے تفرقے کارفرما ہیں، آپ جس سے پوچھیں گے وہ اس کی تعریف وحدت میں کرے گا، یہ ملک ہے، یہ فلاں یونٹ ہے، یہ فلسفہ، وہ فلسفہ، یہ ازم، وہ ازم لیکن کوئی وحدت دوسری وحدت کی روادار نہیں، ہر وحدت نے اپنی زندگی کو اس کے لیے شرط قرار دیا ہے کہ اس کے علاوہ ساری وحدتیں ختم ہوں اس لیے اگر کوئی وحدت دنیا کے لیے رحمت کا پیام رکھتی ہے تو وہ وحدت انسانی اور وحدت ربانی ہے۔“[9]

اس وقت دنیا پر اپنا تسلط رکھنے والی وحدتیں اس کے علاوہ کوئی نصب العین Mandate نہیں رکھتیں کہ انسانی وسائل پر ان کا قبضہ ہو وہ دوسری قوموں کے وسائل کو اپنے تصرف میں لے آئیں خواہ اصل حق دار کو اس میں سے کچھ بھی حصہ نہ ملے۔ ان وحدتوں کو اچھے یا برے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ غلط یا صحیح کا معیار بھی حقیقی نہیں، سب اضافی ہے۔ اگر ان کے مفادات سے ٹکراؤ نہیں رکھتا تو سب ٹھیک ہے اور اگر ان کے مفادات متاثر ہوتے ہیں تو سب غلط ہے۔

یہ سوچ دنیا کے امن کے لیے زہر قاتل ہے۔ جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم میں اصل لڑائی وسائل پر قبضے کی تھی۔ جرمنی کا یہ دعوی تھا کہ دنیا کے تمام وسائل پر برطانیہ کا قبضہ ہے جب کہ یہ حق جرمنی کو حاصل ہے کہ وہ غیر قوموں کے وسائل پر قبضہ کرے اور خلق خدا کو پریشان کرے، دوسری طرف برطانیہ کا بھی یہی موقف تھا۔ یہ وہ عالمی وحدت ہے جس کی طرف انسانوں کو بلایا جا رہا ہے اور مسلمان جس تہذیب کی نقالی میں فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔ ان کفریہ طاقتوں کا پیغام آج بھی نہیں بدلا۔ یہ آج بھی اسی روش پر قائم ہیں اور دیگر قوموں کے وسائل لوٹنے کی جنگ میں برسرپیکار ہیں۔ اس سے مسلمانوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے اور احساس پیدا کرنا چاہیے کہ صرف اسلامی وحدت ہی ایسی وحدت ہے جو انسانیت کے دکھوں کا مداوا کر سکتی ہے۔

> "اسلام نے ان مصنوعی وحدتوں کے مقابلے میں دو حقیقی وحدتوں کو تسلیم کیا اور ان دعوت دی ہے، یہ دنیا کی معصوم ترین، غیر مضر ترین، مثبت اور تعمیری وحدتیں ہیں، ایک وحدت انسانی اور ایک وحدت ایمانی۔ وحدت انسانی تو یہ کہ پوری نسل انسانی ایک آدم کی اولاد ہے اور حضور اکرم ﷺ کے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ایسے معجزانہ الفاظ میں اس پر مہر لگادی۔۔۔۔ ان ربکم واحد وابا کم واحد۔۔۔ ان دو مختصر لفظوں میں وحدت انسانی کا اعلان کیا گیا۔"[10]

ملی وحدت کو نقصان پہنچانے والے عناصر:

ملی وحدت میں ذاتیات اور معروضی حقائق ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ جو وحدت کسی آفاقی اصول پر مبنی ہو وہی کامیاب قرار پاتی ہے۔ دیگر عناصر وحدت کو نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ اپنی ہی بنیاد پر نشتر چلاتے ہیں۔ مولانا ندوی نے دو عناصر ذکر کیے ہیں جو ملی وحدت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

زبان کی وحدت کا نعرہ:

قدیم ادوار میں زبان کی بنیاد پر وحدت کے نعرے لگائے جاتے رہے ہیں۔ یہ امتیاز عرب میں بھی موجود تھا جس کی بنیاد پر عرب و عجم کی تفریق پیدا ہوئی۔ یہ نعرہ آج بھی کامیاب ہے۔ دنیا بھر میں زبان کے حوالے سے تعصب کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ زبان کی وجہ سے علاقائی تقسیم کے مطالبے بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔ بہر حال زبان ایک مستقل شناخت ضرور ہے لیکن یہ اتنی مضبوط بھی نہیں کہ اس کی بنیاد پر کوئی مستقل معاشرہ قائم کیا جاسکے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> "یہ زبان وہ ہے جس کے نام پر زبان والے قتل کیے گئے، جو خود زبان رکھتے تھے، جن کے پاس ویسی ہی فطرت کی دی ہوئی زبان تھی جیسی ان قاتلوں کے پاس تھی۔ لیکن یہ زبان کی نام نہاد وحدت عشق اور عصبیت نے انسانوں کو خاک و خون میں تڑپایا ہے۔"[11]

تہذیبی وحدت کا نعرہ:

تہذیبی وحدت کے نعرے سے مراد یہ ہے کہ ایک علاقے کے رہنے والے اپنے مشترک امور پر نازاں ہو کر اسے اجتماعیت کا سبب قرار دے دیں۔ فن تعمیر، حسن ادا، ادب اور شاعری ذہانت، طباعی اور صناعی امور کو سامنے رکھ کر وحدت قائم کی جائے۔ حالاں کہ یہ عناصر عارضی ہیں۔ ذہانت، طباعی اور صناعی پر زوال آجائے، حسن کے معیارات بدل جائیں جو ایک

فطری تبدیلی ہے تو تہذیبی وحدت کے بندھن ٹوٹ جائیں گے اور وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ جب تہذیب خدا کی رہنمائی اور پیغمبروں کی رہنمائی سے محروم ہو جاتی ہے تو وہ تہذیب نہیں رہتی، وہ اپنے حق میں خواہ تہذیب ہو مگر دوسروں کے حق میں تعذیب بن جاتی ہے۔ تہذیبی وحدت کے بارے میں مولانا ندوی لکھتے ہیں:

> ”آپ نے دیکھا کہ تہذیبیں تہذیبوں سے کس طرح ٹکرائیں اور کلچر کلچر سے ٹکرائے۔ اب یہ طلسم ٹوٹ چکا ہے کہ وحدت کافی ہے۔۔۔ وہ ایک مذہب بن جاتی ہیں، ایک ایسا نظام جو دوسروں پر مسلط کیا جاتا ہے۔ یہ تہذیبیں انسانوں کی غارت گری کی وجہ بنتی ہیں، یہ دنیا کا تجربہ ہے جو بارہا ہو چکا ہے۔“[12]

مثال کے طور پر اگر پاکستان کے رہنے والے یہاں کی قدیم علاقائی تہذیب کو از سر نو زندہ کرنے کا مطالبہ کریں تو فساد پیدا ہو جائے۔ قدیم علاقائی تہذیب اپنے اندر بے شمار خرابیوں کو لیے ہوئے ہو گی، بہت سی خوبیاں اس بنا پر چھوڑ دی جائیں گی کہ وہ اس علاقے کی تہذیب سے ہم آہنگ نہیں اور ایسا رویہ تو خود اسلامی تعلیمات میں بھی روا نہیں ہے۔ اسلام میں وحدت کی بنیاد اصولوں پر ہے۔ یہ اصول آفاقی نوعیت کے ہیں۔ یہاں گورے کو کالے پر، امیر کو غریب پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ یہاں سود خوری، دھوکا فریب، ایذاء رسانی حرام ہے۔ ان اصولوں کی بالادستی کے ساتھ کوئی بھی تہذیب ہو یا ایک سے زیادہ تہذیبیں اور معاشرے موجود ہوں ان میں وحدت پیدا ہو جائے گی اور کسی بھی تہذیب کا انفرادی تشخص مجروح نہیں ہو گا۔ اقبال کہتے ہیں:

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا إِلَى عَصَبِيَّةٍ، وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ، وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلَى عَصَبِيَّة [13]

أَنَا شَهِيدٌ أَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ إِخْوَةٌ **14**

مولانا ندوی نے دو عناصر ذکر کیے ہیں کیوں کہ زیادہ تر وحدت کا نعرہ انہیں دو عناصر پر لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی وحدت کے معیار موجود رہے ہیں مثلاً نسلی برتری کا نعرہ۔ امریکہ میں سیاہ فام اور سفید فام کی تفریق، یہی تفریق برصغیر میں بھی موجود رہی ہے۔ نسلی تفاخر جیسے یہود کے ہاں ایک نسلی تفاخر موجود ہے اور وہ خود کو خدا کی اولاد سمجھتے ہیں۔

اہل مغرب اسلامی دنیا کو انہی عناصر میں غلطاں و پیچاں دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ بڑی حد تک اس مقصد میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ مصر، ترکی اور عرب میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ ترکی میں کمال اتاترک کا انقلاب، مصر میں فرعونی تہذیب کی بازیافت اور عرب میں عرب قومی تحریک اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ یہ عناصر ملی وحدت کے لیے سخت نقصان دہ ہیں اور اہل اسلام کو ان جھوٹے نعروں کے پیچھے چلنے کی دعوت دی جارہی ہے۔

اہل دانش کے لیے امتحان یہ ہے کہ وہ اس مسئلے کا حل سوچیں اور لوگوں کو آگاہ کریں کہ ملی وحدت کا تحفظ اس دور کا اہم مسئلہ ہے کیوں کہ قوم پرستی کا یہ عنصر اسلام کی ساری محنت پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اسلام کا مقصد تو انسانیت میں محبت پیدا کرنا، آپس کے اختلافات کو ختم کرنا ہے۔ اسلام ساری دنیا کو ایک جھنڈے کے نیچے لا کر سب کو باہم شیر و شکر کرنا چاہتا ہے لیکن قوم پرستی کے عناصر اسے ایک علاقے تک محدود کر دیتے ہیں۔ یہ رویہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے اور اسلام کی دعوت کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہے۔ اہل دانش کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ علاقائیت اور لسانی تعصب کا راستہ روکیں اور اس کے برے اثرات سے امت مسلمہ کو محفوظ رکھیں۔

حوالہ جات

[1] ۔ ندوی، سید ابو الحسن علی۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ۔ ص:12

[2] ۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ ص:356-355

[3] ۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ ص:364

[4] ۔ ذہنی اور اعتقادی ارتداد۔ ص:06

[5] ۔ ذہنی اور اعتقادی ارتداد۔ ص:8

[6] ۔ ذہنی اور اعتقادی ارتداد۔ ص:10

[7] ۔ ذہنی اور اعتقادی ارتداد۔ ص:12

[8] ۔ تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات۔ ص:76

[9] ۔ دعوت فکر و عمل۔ ص:47

[10] ۔ دعوت فکر و عمل۔ ص:38

[11] ۔ دعوت فکر و عمل۔ ص:48

[12] ۔ دعوت فکر و عمل۔ ص:49

[13] ۔ ابی داؤ، سلیمان بن اشعث سجستانی۔ السنن۔ باب فی العصبیۃ، ج:4، ص:332

[14] ۔ ابی داؤ، سلیمان بن اشعث سجستانی۔ السنن۔ باب مایقول الرجل اذا سلم، ج:2، ص:83